(21)

جماعت احمدیہ موجودہ جنگ کو خدا تعالیٰ کی تقدیر کا ایک مظاہرہ سمجھے اور اس موقع کو غنیمت سمجھ کر فنونِ جنگ سیکھے

(فرمودہ 10 جولائی 1942ء)

تشہد، تعوّذ اور سورہ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

"دنیا میں دو قسم کے خیالات کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں جو اس دنیا میں بسنے والے انسانوں کو مجبور اور اپنے ماحول کے اثر سے معذور قرار دیتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو ماننے والے جو لوگ ہیں۔ ان میں بھی یہ گروہ پایا جاتا ہے اور جو فلسفی ہیں اور خدا تعالیٰ کو نہیں مانتے۔ ان میں بھی یہ گروہ پایا جاتا ہے۔ ان میں سے جو لوگ خدا تعالیٰ کو ماننے والے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ہر کام کو اپنے قبضہ میں رکھا ہے اور جو تقدیر اس نے مقرر کر دی ہے۔ اس سے انسان سرِ مو اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ اس نے اگر کسی انسان کو نیک بنا دیا ہے تو وہ نیک ہے اور اگر اس نے کسی کو بد بنا دیا ہے تو وہ بد ہے۔ اگر اس نے کسی کو عالم بنا دیا ہے تو اس کے عالم بنانے کی وجہ سے وہ عالم ہے اور اگر اس نے کسی کو جاہل بنا دیا ہے تو اس وجہ سے وہ جاہل ہے۔ جس کے لئے اس نے عالم ہونا مقدر کر دیا ہے وہ کسی صورت میں جاہل نہیں رہ سکتا اور جس کے لئے اس نے جاہل ہونا مقدر کر دیا ہے وہ کسی صورت میں عالم نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کے وجود کے قائل نہیں وہ تقدیر کو اَور رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں

کہ انسان آزاد نہیں۔ آزادی اس کا نام ہے کہ اس پر ارد گرد کے حالات کا اثر نہ پڑے۔ وہ کہتے ہیں کہ تم کہتے ہو ایک شخص عالم بن گیا اور دوسرا جاہل رہا مگر سوال تو یہ ہے کہ عالم کس طرح عالم بن گیا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اس کے ماں باپ امیر تھے۔ وہ اس کی تعلیم کا خرچ برداشت کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ پڑھ لکھ کر عالم ہو گیا مگر جاہل کے والدین غریب تھے اور اس کی تعلیم پر خرچ نہ کر سکتے تھے اس لئے وہ جاہل رہا۔ جو عالم ہو گیا علم کے حصول میں اس کے فعل کا دخل نہیں اور جو جاہل رہا اس کا جاہل رہنا اس کے اپنے فعل کے نتیجہ میں نہیں۔ عالم اس وجہ سے عالم ہو گیا کہ اس کے ماں باپ اس کی تعلیم پر خرچ کر سکتے تھے اور جاہل اس وجہ سے جاہل رہا کہ اس کے ماں باپ اس کی تعلیم پر خرچ نہ کر سکتے تھے۔

دوسری مثال یہ ہو سکتی ہے کہ ایک امیر کا لڑکا جاہل رہا اور غریب کا عالم ہو گیا اس کا سبب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ بھی حالات کا نتیجہ ہے۔ امیر والدین نے اپنے بیٹے کو لاڈ اور پیار میں رکھا اور اس لاڈ کے نتیجہ میں وہ تعلیم نہ حاصل کر سکا۔ اس میں اس بچہ کا کوئی دخل نہیں۔ یہ بھی اس کے ماں باپ کے فعل کا اثر ہے اور جو غریب کا لڑکا عالم ہو گیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ اپنے کسی استاد یا کسی اَور امیر کی نظر پڑھ گیا یا گورنمنٹ سے اسے وظیفہ حاصل ہو گیا اور اس وجہ سے وہ پڑھ لکھ کر عالم ہو گیا۔ ان حالات نے اسے عالم بنا دیا۔ اس کا اپنا اس میں کوئی دخل نہیں یا مثلاً ایک لڑکے کا ذہن اچھا ہوتا ہے اور وہ پڑھ جاتا اور عالم بن جاتا ہے۔ دوسرا کُند ذہن ہوتا ہے اس لئے جاہل رہ جاتا ہے۔ یہ بھی حالات کا ہی اثر ہے۔ اچھا ذہن بھی ماں باپ کی خوراک پرہیز وغیرہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے اچھا ذہن رکھنے والا لڑکا اگر پڑھ گیا تو اپنے برتے پر نہیں بلکہ حالات کے نتیجہ میں۔ اسی طرح کُند ذہن کا جاہل رہنا بھی ارد گرد کے حالات کے نتیجہ میں ہے۔ پس ایک کا علم اور دوسرے کی جہالت دونوں مجبوریوں کے نتیجہ میں ہیں۔

پھر وہ کہتے ہیں نیکی، بدی کو لے لو۔ ایک شخص نیک ہے اور چوری نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ وہ کھاتا پیتا تھا، آسودہ حال تھا، اس کی ضروریات پوری ہوتی جاتی تھیں۔ اس لئے اسے چوری کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اس کے حالات ہی ایسے تھے کہ اسے دوسرے کا مال کھانے کی ضرورت ہی نہ تھی لیکن دوسرا بھوکا ننگا اور محتاج تھا اس نے کھانے کی

کوئی چیز دیکھی اور اٹھالی۔ اس کی یہ چوری مجبوری کی وجہ سے ہے اور اگر اسے چوری کی عادت ہو گئی ہے تو یہ بھی مجبوری کی وجہ سے ہے۔ اسے اپنے حالات نے بار بار چوری پر مجبور کیا اور اس طرح اسے عادت ہو گئی اور دوسرے کو اگر چوری کرنے کی عادت نہیں تو یہ بھی اس کے حالات کا نتیجہ ہے۔ حالات نے اسے کبھی چوری کرنے پر مجبور نہ کیا اور اس وجہ سے اسے چوری کی عادت نہ پڑ سکی اور یہ بھی مجبوری ہی ہے۔ اس کو مسلسل 25،30 سال تک کھانے پینے کو ملتا رہا۔ اس کی ضروریات پوری ہوتی رہیں اس لئے وہ چور نہ بنا اور اسے چوری کی عادت نہ پڑی اور اس نیکی میں اس کا کوئی دخل نہیں جن حالات میں وہ چور نہیں بنا۔ اگر چور بھی ان حالات میں سے گزرتا تو چور نہ بنتا۔ چور کو اپنے حالات کی وجہ سے بار بار چوری کرنی پڑی۔ اس لئے اسے چوری کی عادت ہو گئی جو پھر جاری رہی اور یہ مجبوری ہے اور ایسی مجبوریوں کا طریق اور طرز ایک ہی ہے۔ گو آگے چل کر پھر کچھ اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً چور نے زید کے ہاں چوری کی اور بکر کے ہاں نہ کی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں بھی مجبوری کا دخل ہے۔ زید کی دیوار چھوٹی تھی اور آسانی سے پھاندی جاسکتی تھی اور بکر کی زیادہ اونچی تھی اور اس کا پھاندنا مشکل تھا یا اس رات زید کے گھر میں کوئی نہ تھا۔ سب کے سب کسی شادی یا اور تقریب میں شامل ہونے کے لئے کسی جگہ گئے ہوئے تھے اور بکر گھر پر تھا۔ اس لئے زید کے ہاں چوری ہونا اور بکر کے ہاں نہ ہونا یہ بھی حالات اور مجبوری کے ماتحت ہے۔ غرضیکہ خدا تعالیٰ کو ماننے والا ایک گروہ انسانی افعال کو تقدیر کے ماتحت مانتا ہے اور خدا تعالیٰ کو نہ ماننے والا انسانی مجبوریوں اور ماحول کی مجبوریوں کے ماتحت مانتا ہے۔ اسی طرح ایک اَور گروہ ہے جو کہتا ہے کہ انسان کو خدا تعالیٰ نے آزاد اور مختار بنایا ہے۔ فلسفیوں میں بھی ایک ایسا گروہ ہے جو کہتا ہے کہ انسان مختار ہے اور خدا تعالیٰ کے ماننے والوں میں بھی ایسا گروہ ہے جو کہتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انسان کو سزا دیتا ہے، گرفت کرتا ہے تو معلوم ہوا اسے آزاد بنایا گیا ہے۔ فلسفی اس کی یہ دلیل دیتے ہیں کہ ہر انسان میں دو خاصیتیں پائی جاتی ہیں بلکہ دنیا کی تمام چیزوں میں ان دونوں میں سے ایک خاصیت پائی جاتی ہے۔ ایک اثر ڈالنے کی دوسری اثر قبول کرنے کی۔ وہ کہتے ہیں کہ تم کھوگے لوہے پر اگر تلوار پڑے تو مڑ جاتی ہے مگر لکڑی یا ہڈی پر پڑے تو اسے کاٹ دیتی ہے۔ لیکن اس کی

وجہ یہ ہے کہ لوہا مقابلہ کرتا ہے اور لکڑی وہڈی مقابلہ نہیں کرتی۔ باوجود اس کے کہ انسان پر اس کے ماحول اور اردگرد کے حالات کا اثر پڑتا ہے اس کے اندر ایسا مادہ موجود ہے کہ اگر وہ ارادہ کرلے تو بیرونی اثرات کا مقابلہ کر سکتا ہے اور عادتوں کو چھوڑ سکتا ہے یا اختیار کر سکتا ہے۔ بہرحال جس حد تک انسان آزاد ہے اس حد تک وہ ویسا ہی نیکی میں بھی بڑھ سکتا ہے جیسا بدی میں اور یہ اس کے اختیار میں ہے کہ اس حد تک وہ نیکی یا بدی میں بڑھ جائے یا نہ بڑھے۔ دونوں قسم کے لوگ فلسفیوں میں بھی ہیں اور خدا پرستوں میں بھی۔ دنیا کے مذاہب بھی ان دونوں قسم کے خیالات کو بیان کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی جبری اور قدری دونوں قسم کے لوگ ہیں۔ جبریوں کا عقیدہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے مجبور بنایا ہے اور قدری کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو مقدرت عطا کی ہے۔ چاہے تو نیکی کی طرف چلا جائے اور چاہے بدی کی طرف۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے موت وحیات بنائی ہے مگر موت سے بچنے اور حیات کو حاصل کرنے کے قواعد بھی بنا دیئے ہیں اگر وہ یہ قواعد نہ بناتا تو پھر علاج بھی پیدا نہ کرتا، غذا بھی نہ بناتا۔ اگر ایک انسان نے بہرحال سو پچاس یا بیس سال زندہ رہنا تھا تو خدا تعالیٰ نے غذا کیوں پیدا کی۔ غذا اور علاج پیدا کرنے کے یہ معنی ہیں کہ صحت اور بیماری اور موت و حیات میں انسان کا دخل ہے۔ اگر موت ضروری تھی اور مقررہ وقت پر اس کا آنا لازمی تھا تو غذا کی کیا ضرورت تھی۔ غذا پیدا کرنا اور علاج وغیرہ بنانے کے یہ معنی ہیں کہ انسان اپنی صحت کو اچھا بھی بنا سکتا ہے اور خراب بھی کر سکتا ہے۔ موت کو قریب بھی لا سکتا ہے اور دور بھی کر سکتا ہے۔ تمام مذاہب میں کچھ لوگ جبری ہیں کچھ قدری۔ تناسخ کو ماننے والے سب جبری ہیں جو کہتے ہیں کہ گزشتہ جون میں جو کچھ ہو چکا وہ بدل نہیں سکتا۔

اسلام کی تعلیم کو اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ نہ جبر کا قائل ہے اور نہ قدر کا۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو مجبور بنایا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر انسان کو مجبور بنایا جاتا تو ہم اسے نیک بناتے۔ ہم منبع ہیں تمام نیکیوں کے۔ پس اگر ہم نے جبر کرنا ہوتا تو یہ جبر اپنی صفت کے مطابق کرتے اور انسان کو نیک بناتے اور جو مخلوق جبر کے ماتحت بنائی ہے وہ نیکی پر ہی بنائی گئی ہے۔ فرشتے جبر کے ماتحت ہیں اور اس لئے ان میں بدی کرنے کی

طاقت ہی نہیں اور وہ بدی کر ہی نہیں سکتے۔ فرشتوں کی زندگی جبر کی ہے اور وہ نیک ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے جو مخلوق جبر کے قانون کے ماتحت بنائی ہے وہ نیک ہی ہے۔ پس اسلام اس طرح جبر کو تسلیم نہیں کرتا مگر مقدرت کو بھی اس رنگ میں نہیں مانتا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے مقدرت دے دی ہے۔ اب خدا تعالیٰ کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ جیسا نیچریوں کا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو بنا دیا ہے اور اب وہ خالی ہو کر تماشہ دیکھ رہا ہے۔ اسلام یہ بتاتا ہے کہ ایک حد تک جبر بھی چلتا ہے اور ایک حد تک تقدیر بھی چلتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے ایک حد تک انسان کو آزاد بھی بنایا ہے، کھانا پینا، روشنی، نظارے، ہوا کے استعمال میں آزاد ہے۔ اس کے اختیار میں ہے کہ صاف پانی پیئے اور اچھی ہوا میں رہے، روشنی میں رہے، عمدہ غذا کھائے اور اپنی صحت کو اچھا رکھے۔ مگر اس کے باوجود پھر تقدیر کا بھی دخل ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انسان اچھی غذا کھالے تو اس کی صحت درست رہے گی مگر یہ نہیں کہ اگر وہ اچھی غذا کھائے تو بہر حال اس کی صحت درست ہی رہے گی یا اگر انسان کی صحت اس کی کسی غلطی کی وجہ سے خراب ہوئی ہے تو بہر حال خراب ہی رہے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ دخل دے اور جب اس کی صحت اچھی رہنی چاہئے وہ خراب ہو جائے یا جب انسان سے کوئی ایسی غلطی ہو گئی ہو کہ جس کے نتیجہ میں اس کی صحت خراب ہو جانی چاہئے خدا تعالیٰ دخل دے اور وہ خراب نہ ہو۔ اور جب اس کی صحت اچھی رہنی چاہئے وہ اچھی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے دعا پر زور دیا ہے۔ اگر انسان کُلِّیَّۃً آزاد تھا تو پھر دعا کے کیا معنی ہیں۔ اگر کلّی طور پر اس کی صحت کا انحصار اچھی غذا پر ہے۔ اور اگر لازماً بد پرہیزی کے نتیجہ میں بیماری ہے تو دعا بے فائدہ ہے۔ پھر تو صرف علاج کا کام باقی رہ جاتا ہے، دعا کا نہیں۔ دعا کے معنی تو یہ ہیں کہ باوجود پورے طور پر بیماری کے سامانوں کے اللہ تعالیٰ چاہے تو صحت بھی دے سکتا ہے۔ اس کی ایک موٹی مثال حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیش گوئی میں ملتی ہے۔ آپؑ کی پیشگوئی کے ماتحت طاعون پھیلی۔ اب عام قاعدہ تو یہی ہے کہ طاعون کے کیڑے جس کے پاس جائیں وہ بیمار ہو جائے۔ طاعون قادیان میں بھی آئی مگر خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ آپ کے گھر میں طاعون نہ آسکے گی۔ وہ کیڑے آپؑ کے مکان کے دائیں بھی

آئے بائیں بھی آئے اور موتیں پیدا کیں، سامنے بھی گئے اور موتیں پیدا کیں اور پچھواڑے بھی گئے اور وہاں بھی موتیں پیدا کیں۔ طاعون کے کیڑوں نے آپ کے مکان کے چاروں طرف چکر لگائے مگر کوئی کیڑا آپؑ کے مکان میں داخل نہ ہو سکا۔ اگر سب کچھ سامانوں کا ہی نتیجہ ہوتا تو یہ کیا چیز تھی جس نے طاعون کے کسی کیڑے کو آپ کے گھر میں داخل نہ ہونے دیا۔ یہ نظارہ بتاتا ہے کہ گو اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزادی دی ہے مگر کبھی کبھی وہ دخل بھی دیتا ہے اور جب وہ دخل دے تو سارے سامان بے کار ہو جاتے ہیں چنانچہ اس نے فرمایا کہ ہم نے طاعون کے کیڑے کو بے کار کر دیا ہے اور وہ اب آپ کے گھر میں نہ جا سکے گا۔ یا لیکھرام کا واقعہ بھی اس امر کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ چاہے تو صحت کے تمام سامانوں کے ہوتے ہوئے بھی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ فرما دیا تھا کہ عید کے دوسرے دن اس کی موت ہو گی اور چھ سال کے اندر اندر۔ اب چھ سال تک سال میں دو تین روز کے لئے حفاظت کے خاص طور پر سامان کر لینا کونسا مشکل امر ہے اور یہ اس کے اختیار میں تھا کہ ان دنوں میں حفاظت کے خاص سامان مہیا کر لیتا مگر باوجود اس کے خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئی کو پورا کر دیا حالانکہ ظاہری سامان اس کے خلاف تھے۔ 6 مارچ اس کی موت مقدر تھی اور ''یکم مارچ کو لیکھرام کو سبھا کی طرف سے ملتان پہنچنے کا حکم ہوا۔ وہاں چار مارچ تک اس نے چار لیکچر دیئے پھر سبھا نے اسے سکھر جانے کے لئے تار دیا مگر وہاں پلیگ ہونے کی وجہ سے ملتان کے آریہ سماجیوں نے وہاں جانے سے روک دیا۔ پھر پنڈت لیکھرام مظفر گڑھ جانے کے لئے تیار ہوئے مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ پھر سیدھے کیوں لاہور کو لَوٹ پڑے اور چھ مارچ دوپہر کو یہاں پہنچ گئے۔'' اگر وہ اس روز واپس نہ آتا تو یہ پیشگوئی پوری نہ ہوتی مگر باوجود اس کے کہ بظاہر اس کے باہر رہنے کا موقع پیدا ہو گیا پھر بھی وہ لاہور پہنچ گیا اور وقت مقررہ پر قتل ہو گیا۔ یہ مثال اس امر کی ہے کہ صحت اور حفاظت کے سارے سامانوں کے ہوتے ہوئے بھی انسان ہلاک ہو سکتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ انسان کے کاموں میں دخل دیتا ہے لیکن اس نے اسے آزاد بھی چھوڑا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات سے دو تین سال قبل حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو شدید کھانسی ہوئی۔ میری عمر اس وقت

17 سال کے قریب تھی اور میرے سپرد آپ کی دوائی وغیرہ پلانے کی خدمت تھی اور قدرتی طور پر جس کے سپرد کوئی کام کیا جائے وہ اس میں دخل دینا بھی اپنا حق سمجھنے لگتا ہے۔ مَیں بھی اپنی کمپاؤنڈری کا یہ حق سمجھتا تھا کہ کچھ نہ کچھ دخل آپ کے کھانے پینے میں دوں۔ چنانچہ مشورہ کے طور پر عرض کر بھی دیا کرتا تھا کہ یہ نہ کھائیں، وہ نہ کھائیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاول کے نسخے بھی تیار ہو کر استعمال ہوتے تھے اور انگریزی دوائیاں بھی۔ مگر کھانسی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ یہ 1907ء کا واقعہ ہے اور عبدالحکیم مرتد نے آپ کی کھانسی کی تکلیف کا پڑھ کر لکھا تھا کہ مرزا صاحب سِل کی بیماری میں مبتلا ہو کر فوت ہوں گے۔ اس لئے ہمیں کچھ یہ بھی خیال تھا کہ غلط طور پر بھی اسے خوشی کا کوئی بہانہ نہ مل سکے مگر آپ کو کھانسی کی تکلیف بہت زیادہ تھی اور بعض اوقات ایسا لمبا اوچھو آتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سانس رک جائے گا ایسی حالت میں باہر سے کوئی دوست آئے اور تحفہ کے طور پر پھل لائے۔ مَیں نے وہ حضور کے سامنے پیش کر دیئے۔ آپ نے انہیں دیکھا اور فرمایا کہہ دو جَزَاکَ اللّٰہُ اور پھر ان میں سے کوئی چیز جو غالباً کیلا تھا اٹھایا۔ اور مَیں چونکہ دوائی وغیرہ پلایا کرتا تھا اس لئے شاید مجھے سبق دینے کے لئے فرمایا کہ یہ کھانسی میں کیسا ہوتا ہے؟ مَیں نے کہا اچھا تو نہیں ہوتا مگر آپ مسکرا پڑے اور چھیل کر کھانے لگے۔ مَیں نے پھر عرض کیا کہ کھانسی بہت سخت ہے اور یہ چیز کھانسی میں اچھی نہیں۔ آپ پھر مسکرائے اور کھاتے رہے۔ مَیں نے اپنی نادانی سے پھر اصرار کیا کہ نہیں کھانا چاہئے۔ اس پر آپ پھر مسکرائے اور فرمایا مجھے ابھی الہام ہوا ہے کہ کھانسی دور ہو گئی۔ چنانچہ کھانسی اُسی وقت سے جاتی رہی حالانکہ اُس وقت نہ کوئی دوا استعمال کی اور نہ پرہیز کیا بلکہ بدپرہیزی کی اور کھانسی بھی دور ہو گئی۔ اگرچہ اس سے پہلے ایک مہینہ علاج ہوتا رہا تھا اور کھانسی دور نہ ہوتی تھی۔ تو یہ الٰہی تصرف ہے۔ یوں تو بدپرہیزی سے بیماریاں بھی ہوتی ہیں اور علاج سے صحت بھی ہوتی ہے مگر جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے دخل بھی دے دیتا ہے اور دعا کا ہتھیار اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو سکھایا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور جا کر کہے کہ مَیں آزادی نہیں چاہتا مَیں اپنے حالات سے تنگ آگیا ہوں، آپ مہربانی کر کے میرے معاملات میں دخل دیں اور اللہ تعالیٰ بھی دیکھتا ہے کہ بندہ متوکّل ہو گیا ہے اور چاہتا ہے کہ مَیں اس کے معاملات میں

دخل دوں تو وہ دیتا ہے۔ پس گو اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزادی دی ہے مگر وہ دخل بھی دیتا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے انگلیاں دی ہیں، مُنہ دیا ہے اس کے سامنے کھانا آتا ہے وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے لقمہ اٹھاتا ہے اور مُنہ میں ڈالتا ہے۔ فرشتے کہیں بھی اس کا ہاتھ نہیں روکتے۔ دنیا کی آبادی اس وقت دو ارب کے قریب ہے اور ہر جگہ لوگ عام طور پر دو بار کھانا کھاتے ہیں اور بعض ملکوں میں تو پانچ پانچ بار بھی کھاتے ہیں اور پھر مقررہ اوقات پر کھانوں کے علاوہ شغل کے طور پر بھی کئی چیزیں کھاتے پیتے ہیں۔ ہر شخص کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے لقمہ اٹھاتا اور منہ میں ڈالتا ہے اور وہ گلے سے نیچے اتر جاتا ہے، کبھی کسی ایک جگہ بھی تو ایسا نہیں ہوا کہ خدا تعالیٰ یا فرشتوں نے کسی کے ہاتھ کو روکا ہو۔ یہ ایک عام قانون ہے جس میں کافر و مومن کی بھی کوئی تمیز نہیں کہ کسی انسان کا ہاتھ کھانے سے نہیں روکا جاتا مگر جب خدا تعالیٰ کی تقدیر چلتی ہے تو ہاتھ رک بھی جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک دفعہ کھانا لایا گیا آپ نے اس میں ہاتھ ڈالا، لقمہ بنایا، اسے مُنہ کے پاس لے گئے مگر پھر اسے پھینک دیا اور فرمایا کہ یہ کھانا خدا تعالیٰ کے حکم سے بولا ہے اور اس نے کہا ہے کہ مجھ میں زہر ہے اور آخر میزبان نے مان لیا کہ مَیں نے آپؐ کو ہلاک کرنے کی غرض سے اس میں زہر ڈالا تھا۔[1] تو دیکھو جب خدا تعالیٰ کی مشیت ہوئی وہی سامان جو روزانہ چلتے تھے یکدم بدل گئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے خاص تقدیر جاری کر دی اور آپ کو اطلاع دے دی کہ اس کھانے میں زہر ہے اسے نہ کھایا جائے۔ اسی طرح سید عبد اللطیف صاحب شہید کا ایک واقعہ ہے جب آپ افغانستان کو واپس جا رہے تھے تو لاہور میں کچھ تحائف وغیرہ خریدنے کے لئے ٹھہرے۔ انہی دنوں وہاں کسی احمدی کے لڑکے کے ولیمہ کی دعوت تھی جس میں اس نے آپ کو بھی مدعو کیا۔ آپ تشریف لے گئے۔ بہت سے اَور دوست بھی موجود تھے۔ آپ کو احترام کے ساتھ بٹھایا گیا۔ جب کھانا شروع ہوا تو آپ نے بھی لقمہ اٹھایا مگر پھر اسے پھینک دیا اور استغفار کرتے ہوئے وہاں سے چل دیئے۔ بعض دوست آپ کے پیچھے گئے اور کہا کہ میزبان کی بہت دل شکنی ہو گی آپ اٹھ کر نہ جائیں اور کھانے میں شریک ہوں مگر آپ نے کہا کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ:-

"یہ کھانا سؤر ہے"

انہوں نے عرض کیا صاحب خانہ مسلمان اور احمدی ہے۔ حلال کھانا پکایا گیا ہے۔ سوٴر کا کیا مطلب ہے۔ مگر آپ نے کہا کہ مجھے یہی الہام ہوٴا ہے اور مَیں یہ کھانا نہیں کھا سکتا۔ آخر جب تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوٴا کہ در حقیقت ولیمہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوٴا تھا۔ ہماری شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب میاں بیوی آپس میں ملیں اور حقیقی صورت میں میاں بیوی کے تعلقات قائم ہو جائیں تو ولیمہ ہوتا معلوم ہو جائے کہ بیوی پورے مہر کی حقدار ہو گئی ہے۔ چونکہ ایسی بات کا اعلان اور الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا اس لئے شریعت نے اس کے لئے ولیمہ کا طریق مقرر کر دیا ہے تا آئندہ جھگڑا وغیرہ اگر کوئی پیدا ہو تو فیصلہ میں آسانی رہے۔ غرض اس وقت تحقیقات سے معلوم ہوٴا کہ گو ولیمہ کی دعوت کی گئی مگر در حقیقت ایسا فعل ہوٴا ہی نہ تھا اور لڑکے والوں نے شرم کے مارے ولیمہ کر دیا اور چونکہ ایسی دعوتِ ولیمہ شریعت کے منشاء کے خلاف تھی اللہ تعالیٰ نے الہاماً آپ کو اس سے روک دیا کیونکہ ایک اعلیٰ درجہ کے متقی انسان کے لئے تھوڑی سی بُری بات بھی بڑی ہوتی ہے اس لئے الہام میں آپ کے لئے اس کھانے کو سوٴر کہا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے جہاں دخل دینا ہوتا ہے وہاں دے دیتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے بتایا ہے کہ دونوں طرح اللہ تعالیٰ کی حکومت چلتی ہے اس نے انسان کو مختار بھی بنایا ہے۔ ہر انسان کھانا کھاتا ہے تو اس کا پیٹ بھرتا ہے، پانی پیتا ہے تو پیاس سے سیری ہوتی ہے، سونے سے طبیعت کو آرام ملتا ہے، آگ جلتی ہے تو گرمی محسوس ہوتی ہے، گرم کپڑے پہننے سے بدن گرم ہوتا ہے، سرد کپڑے پہننے سے گرمی نہیں لگتی۔ انسان شلغم کھاتا ہے تو اس کی تاثیر ظاہر ہوتی ہے، مولی کھاتا ہے تو اس کی تاثیر، کھاتا تو انسان اپنی مرضی سے ہے مگر تاثیر وہی ظاہر ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ نے اس چیز میں پیدا کی ہے۔ انسان اگرچہ مختار ہے مگر تاثیر کو وہ نہیں بدل سکتا۔ اگر وہ چاہے کہ آگ اس کی پیاس بجھا دے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ یا وہ چاہے کہ پانی کھانا پکا دے تو یہ ممکن نہیں۔ وہ آزاد تو ہے مگر اسی حد تک جس حد تک کہ مختلف چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے مختلف تاثیریں رکھی ہیں۔ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ نے جو خواص رکھے ہیں اسی حد تک وہ ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جہاں خدا تعالیٰ کی حد بندی ختم ہو جاتی ہے وہاں انسان خواہ کتنا زور لگائے کچھ نہیں کر سکتا۔ حضرت خلیفہ اول اس کی ایک لطیف مثال بیان کیا کرتے تھے۔ آپ فرماتے کہ اگر

کوئی انسان زبان پر مصری کی ڈلی رکھ کر اسے کہے کہ وہ نمک چکھے تو وہ کبھی نہ چکھے گی۔ وہ میٹھے کو نمک کبھی نہیں بتا سکتی۔ مگر کوئی انسان اگر اسے کہے کہ کہہ خدا نہیں ہے تو وہ کہہ دیتی ہے کہ خدا نہیں ہے۔ اتنی چھوٹی سی بات وہ نہیں مانتی اور اتنی بڑی مان لیتی ہے اور یہ اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے اسی طرح قانون مقرر کر دیا ہے۔ جب کوئی زبان یہ کہہ رہی ہوتی ہے کہ خدا کوئی نہیں تو وہ اس وقت بھی خدا کی خدائی کا اقرار کر رہی ہوتی ہے کیونکہ اس کی دی ہوئی طاقت سے وہ چل رہی ہوتی ہے۔ انسان کی زندگی مختلف دائروں میں چلتی ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ نے اسے آزادی دی ہے اس حد تک وہ آزاد ہے مگر جب وہ دخل دیتا ہے تو وہ آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ دنیا میں طاعون اور ہیضہ کے جراثیم ہر انسان پر اثر کرتے ہیں مگر جب خدا تعالیٰ کہہ دیتا ہے کہ اثر نہیں کرنا تو وہ بیکار ہو جاتے ہیں اور آزادی چھن جاتی ہے اور جب وہ حکم دیتا ہے تو اسی چیز سے دوسرے خواص ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ زہر میں ہلاک کرنے کی تاثیر اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے مگر کبھی وہ تریاق کا کام بھی دیتا ہے، پانی تریاق بھی ہے مگر کبھی وہ زہر بن جاتا ہے۔ بعض اوقات انسان زہر کھاتا ہے تو بجائے ہلاک ہونے کے اس کی طاقتیں بڑھ جاتی ہیں مگر بعض اوقات وہ پانی کا ایک گھونٹ پیتا ہے تو ہیضہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بے شک حد بندیاں مقرر کی ہیں مگر جب وہ دخل دیتا ہے تو وہ سب حد بندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ پس مومن وہی ہے جو اس حکمت کو سمجھ کر خدا تعالیٰ کے تصرف کو تسلیم کرے اور جب تک وہ ایسا نہ کرے کبھی بھی کامل مومن نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف دائرے مقرر کر کے حکم دیا ہے کہ ان میں اس طرح عمل کرو۔ جہاں اس نے آزادی دی ہے وہاں اس نے یہ بھی مقدر کر دیا ہے کہ اسباب سے کام لو۔ مگر تقدیر کو نہ بھولنا مگر جہاں تقدیر کا حکم ہے وہاں فرمایا ہے کہ توکّل کرو مگر اسباب کو بھی نہ بھولنا۔ دونوں بیک وقت چلتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دونوں کے مطابق چلنے والوں کو بارور کرتا ہے۔ جہاں اس نے انسان کو اختیار دیا ہے وہاں تقدیر بھی ساتھ لگائی ہے۔ کھانے پینے، پہننے میں آزادی دی ہے مگر ساتھ دعائیں بھی سکھائی ہیں۔ اس کا یہ قانون ہے کہ کھانا کھانے سے پیٹ بھرتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا ہے کہ کھانا کھانے یا پانی پینے سے پہلے بِسْمِ اللّٰہ کہہ لو۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مَیں اللہ تعالیٰ کی مدد چاہتا ہوا کھانا کھاتا یا پانی پیتا ہوں۔ یہ انسان کی

آزادی کا حلقہ ہے مگر تقدیر کو بھی ساتھ لگا دیا ہے اور ایسی صورت میں انسان کو یہ اجازت نہیں کہ اسباب اور تدبیر کو چھوڑ دے۔ اگر کوئی کھانا کھانا چھوڑ دے اور کہے کہ مَیں توکّل کرتا ہوں تو وہ گنہگار ہو گا۔ اگر بیمار اپنا علاج نہ کرے تو وہ گنہگار ہو گا سوائے اس کے کہ تقدیر خاص جاری ہو۔ جب خدا تعالیٰ یہ کہے کہ کھانا نہیں کھانا تو کھانے والا گنہگار ہو گا۔ مگر عام قانون کے ماتحت نہ کھانے والا گنہگار ہے کیونکہ حکم یہی ہے کہ کھانا کھایا جائے مگر کھانے سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ کہنے کی ہدایت فرمائی ہے کیونکہ گو کھانا پیٹ بھرنے کا موجب ہوتا ہے مگر بعض اوقات ہیضہ کا موجب بھی بن جاتا ہے۔ پھر سیری تکبّر کا موجب بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ جب کھا چکو تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہو۔ گو یہ دائرہ تدبیر کا ہے مگر تقدیر بھی ساتھ شامل ہے۔ کوئی تدبیر مکمل نہیں ہو سکتی جب تک تقدیر اس کے ساتھ شامل نہ ہو اور کوئی تقدیر مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ تدبیر شامل نہ ہو اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہُ۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ تدبیر نہ کرنا ۔ایسے وقت میں تدبیر کرنا گناہ ہو جاتا ہے مگر عام قاعدہ یہی ہے کہ تدبیر کے دائروں میں تدبیر مقدم ہوتی ہے اور تقدیر دوسرے درجہ پر مگر جو تقدیر کا دائرہ ہے وہاں توکّل مقدم ہے اور اسباب کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ جب کوئی انسان بیمار ہو تو علاج اصل کام ہے اور دعا ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اصل ذریعہ اسباب ہیں مگر اسباب کی حفاظت اور ان کے بے راہ نہ ہونے کے لئے دعا سکھائی ہے مگر جب تقدیر آتی ہے تو وہاں اسباب کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر اسباب میسر نہ آئیں تو نہ آئیں۔ اسی طرح اسباب کے دائرہ میں دعا کی طرف کسی وقت رغبت نہ بھی ہو تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اسباب چھوڑ دیئے جائیں۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ مثلاً کسی علاقہ میں طاعون یا ہیضہ یا کوئی اَور وبا پھیلتی ہے اس صورت میں شریعت کا حکم ہے کہ اس علاقہ میں نہ جاؤ اور یہ مقدم ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مَیں دعا کر کے اس علاقہ میں چلا گیا تھا کیونکہ یہاں دعا کا مقام دوسرے نمبر پر ہے مگر استثنائی طور پر یہ دائرہ ٹوٹ بھی جاتا ہے مثلاً طبیب وہاں جاتا ہے یا ایسے علاقہ میں فساد ہو جاتا ہے تو کوئی حاکم اپنے فرض کو ادا کرنے کے لئے جاتا ہے۔ ان کا وہاں جانا ہی ضروری ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہاں طاعون یا ہیضہ ہے ہم وہاں کس طرح جائیں۔ یہ تو تدبیر کی مثال ہے۔

تقدیر کی مثال جہاد ہے۔ وہاں اصل حکم مرنے کا ہے جیسے وباء کے موقع پر جان کو بچانا اصل حکم ہے۔ جہاد کے موقع پر اصل حکم جان دینا ہے۔ جہاں جان بچانے کا حکم ہے وہاں جان دینے کے خطرہ میں پڑنا استثنائی حیثیت رکھتا ہے مثلاً کسی طبیب یا حاکم کا اس علاقہ میں جانا، ان کے لئے یہی حکم ہے کہ وہاں جاؤ اور جان کی پروا نہ کرو مگر جہاں جان دینے کا حکم ہے وہاں جان بچانے کی تدبیر کرنا ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے جہاد کے موقع پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس گھوڑا نہیں یا تلوار نہیں۔ مَیں جہاد کے لئے کس طرح جاؤں۔ جہاد کا جب بھی حکم ہو سامان ہو یا نہ ہو جانا ضروری ہے۔ سوائے اس کے کہ کوئی انسان جسمانی لحاظ سے معذور ہو۔ بعض احادیث میں آتا ہے کہ بدر کی جنگ میں بعض صحابہؓ کے پاس صرف لاٹھیاں تھیں تلواریں نہ تھیں۔ تو جب تقدیر جاری ہو تو وہاں تدابیر ثانوی درجہ اختیار کر لیتی ہیں اور ان کا فقدان انسان کو معذور قرار نہیں دیتا۔ غرض دنیا میں دو قسم کے حالات خدا تعالیٰ کی طرف سے جاری ہیں۔ ایک وہ جب تدبیر کا پہلو بھاری ہوتا ہے اور ایک وہ جن میں تقدیر کا پہلو بھاری ہوتا ہے۔ عذاب یا انقلاب کے مواقع دوسری قسم کے ہیں۔ ان میں تقدیر اپنا کام کر رہی ہوتی ہے۔ اس وقت انسان کا تدابیر کی طرف زیادہ دھیان دینا اپنی قسمت سے کھیلنا ہوتا ہے۔ اس وقت انسان کو توکّل سے کام لے کر خدا تعالیٰ کی تقدیر کو قبول کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کی نیک تقدیر دعاؤں کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

مَیں دیکھتا ہوں کہ ہماری جماعت کے بعض افراد میں بوجہ اس کے کہ انہیں ہمیشہ امن کے ساتھ رہنے کی تعلیم دی جاتی ہے کچھ بزدلی پیدا ہو گئی ہے حالانکہ یہ نیکی نہیں کہ بزدل ہو کر انسان امن کو قائم رکھے۔ بزدل ہو کر کون امن سے نہیں رہتا۔ جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ کیسا بیوقوف ہے وہ انسان جو کسی خصّی کی نسبت یہ کہے کہ وہ بڑا پاکباز ہے یا اندھے کے متعلق کہے کہ وہ بڑا پاک نظر ہے۔ اس کی تو نظر ہی نہیں وہ پاک نظر کس طرح ہو گیا۔ اسی طرح بزدل پُرامن کیونکر ہو سکتا ہے وہ تو بزدلی کی وجہ سے فساد کر ہی نہیں سکتا۔ پُرامن وہی ہے جو مارنے کی طاقت رکھتا اور پھر امن سے رہتا ہے مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ ہماری جماعت کا ایک طبقہ امن کی تعلیم سن سن کر بزدل ہو گیا ہے اور توکّل و تقدیر کے مقام کو بھول

گیا ہے۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض جگہ جب ہماری جماعت میں سے نوجوانوں کو بھرتی کرنے کے لئے افسر پہنچے تو بعض نوجوان تو تیار ہو گئے مگر ان کی مائیں روتی ہوئی آ گئیں کہ ہائے ہائے میرا بچہ مارا جائے گا اور ظاہر ہے کہ ایسے بزدل کیا قربانی کر سکتے ہیں۔ قربانی کے لئے تیاریاں ضروری ہوتی ہیں۔ دیکھو خدا تعالیٰ کے لئے فاقہ کرنے کا موقع تو شاید ہی کسی آدمی کو کبھی ملتا ہو مگر اللہ تعالیٰ ہر سال ایک ماہ بھوکا رہنے کی مشق کراتا ہے۔ اصل دن تو شاید کبھی آتا ہی نہیں مگر مشق ہر سال میں ایک ماہ کرائی جاتی ہے اس لئے کہ کوئی کام بغیر مشق کے نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنا مال لٹا دینے کا موقع تو شاذ ہی کسی کو ملتا ہے مگر زکوٰۃ ہمیشہ کے لئے مقرر کر دی گئی ہے۔ پس قربانی کے لئے مشق بہت ضروری چیز ہے۔ جو شخص سمجھتا ہے کہ مجھے تیاری کی کوئی ضرورت نہیں جب وقت آئے گا مَیں قربانی کر لوں گا وہ نادان ہے۔ اور مَیں اس کی آنکھیں کھول دینا چاہتا ہوں کہ وہ وقت آنے پر ضرور ٹھوکر کھائے گا۔ جہاں تک مَیں سمجھتا ہوں ہماری جماعت کو چاہئے تھا کہ اس جنگ کو خدا تعالیٰ کی تقدیر کا ایک مظاہرہ سمجھتے ہوئے اسے نعمت غیر مترقّبہ سمجھتی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جاری کر کے ہمارے لئے یہ موقع پیدا کر دیا کہ اگر چاہیں تو فنون جنگ سیکھ سکتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے یہ ایک ایسا موقع بہم پہنچایا تھا کہ جماعت کے دوستوں کو اس پر خوشی سے اچھلنا چاہئے تھا مگر بجائے اس کے کہ خوش ہوتے اور نعمت سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھاتے وہ فوج میں داخل ہونے سے ڈرتے ہیں۔ جنگ کو بحیثیت ایک بلا کے تو برا ہی سمجھنا چاہئے اور فوج میں داخل ہونے کے معنے یہی ہیں کہ اسے بَلا سمجھتے ہیں اور دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر فنون جنگ سیکھنے کے لحاظ سے اس موقع کو غنیمت سمجھنا چاہئے تھا کہ جرأت اور بہادری پیدا کرنے کا سامان میسر آ گیا۔

مَیں ان عورتوں پر جنہوں نے یہ بُرا نمونہ دکھایا اظہارِ افسوس کرتا ہوں اور ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان میں سے کوئی ہے جو اپنے بچوں کے لئے ایک سال کی عمر کی بھی ضمانت دے سکے اور کیا جب جنگ ختم ہو جائے گی تو انہیں شرم نہ آئے گی کہ ان کی عزت کی حفاظت کے لئے ہندو، سکھ، غیر احمدی اور بعض احمدی تو میدان جنگ میں گئے مگر ان کے بچوں میں سے کوئی نہ گیا۔ اگر خدا تعالیٰ نے ہمارے ملک کو خطرہ سے بچا لیا تو کیا ان کو غیرت نہ آئے گی

کہ ان کی عزت کی حفاظت ہندوؤں، سکھوں اور غیر احمدیوں اور دوسرے احمدیوں کے ذریعہ ہوئی اور انہوں نے خود اس میں کوئی حصہ نہ لیا اور کیا ان کے اندر شرافت کا جو جذبہ ہے وہ اس احساس سے ان کی زندگی کو تلخ نہ بنا دے گا۔ مومن تو کسی کا احسان نہیں اٹھایا کرتا پھر وہ نوجوان جو فوج میں جانے سے ہچکچاتے ہیں کس طرح اس بے غیرتی کو برداشت کریں گے کہ ان کی، ان کی بیویوں، ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی حفاظت ہندوؤں، سکھوں اور غیر احمدیوں نے کی مگر وہ خود چارپائی پر گھر میں بیٹھے رہے۔ پھر ایسی عورتوں سے مَیں پوچھتا ہوں کہ وہ لوگ جو اس وقت لڑائی میں گئے ہوئے ہیں اگر وہ اس بلا کو نہ روک سکے تو ان کے بیٹوں کی زندگیاں ان کے کس کام آسکیں گی۔ کیا وہ گھروں میں نہ مارے جائیں گے اور کیا وہ یہ پسند کرتی ہیں کہ ان کے لڑکے لڑائی میں جا کر عزت کی موت تو نہ مریں مگر گھروں میں بزدلوں کی طرح مارے جائیں اور دیکھنے والے ان کو دیکھ کر کہیں کہ کیسے بے حیا تھے یہ لوگ جو اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کی عزت کو نہ بچا سکے۔ پھر ایسی ماؤں کو سوچنا چاہئے کہ جو نوجوان پہلے جا چکے ہیں وہ بھی تو ماؤں کے ہی بیٹے ہیں۔ وہ کہہ سکتی ہیں کہ وہ چند روپوں کے لئے چلے گئے مگر مَیں کہوں گا کہ اس کے یہ معنے ہوئے کہ چند روپوں میں تمہارے ایمان سے زیادہ کشش ہے۔ وہ تو بہت بہادر نکلے جو سترہ روپے کے لئے چلے گئے مگر تمہارا ایمان تو سترہ روپے سے بھی کم قیمت کا ہوا۔ وہ سترہ روپے زیادہ قیمتی ہوئے جن کے لئے انہوں نے جانیں دے دیں مگر تمہارا ایمان تمہیں اپنے بیٹوں کو گھروں سے نکالنے پر بھی آمادہ نہ کر سکا۔

خوب یاد رکھو کہ وقت آنے پر ایسے لوگ کوئی کام نہیں دے سکتے۔ دیکھو! ایک کے بعد ایک سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلتی چلی گئی مگر وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ مسیح آئے گا تو ہم لڑیں گے اور یہ سب واپس لے لیں گے جس طرح آج یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ دنیوی لڑائی ہے۔ جب احمدیت کے لئے لڑنے کا موقع آئے گا تو ہم لڑیں گے اور اپنے کرتب دکھائیں گے مگر جانتے ہو جب مسیح آیا تو مسلمانوں نے کیا کرتب دکھائے؟ جان و مال قربان کرنے کے بجائے وہ پتھر لے کر نکلے کہ مسیح کو مار ڈالیں۔ یہ اس لمبی بے حیائی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے لئے کوئی قربانی نہ کی تھی۔ وہ ہمیشہ جھوٹ بولتے رہے کہ مسیح آئے گا تو قربانیاں کریں گے

اور اس وجہ سے خدا تعالیٰ نے ان سے قربانی کی طاقت چھین لی۔ پس اسی طرح جو لوگ آج کہتے ہیں کہ دین کے لئے لڑائی کا موقع آیا تو وہ لڑیں گے۔ وہ صرف نفس اور شیطان کے دھوکے میں مبتلا ہیں۔ بغیر تیاری کے کوئی قربانی ہرگز نہیں کی جا سکتی اور اگر کبھی موقع آیا تو یہ لوگ بھاگنے والوں میں سب سے آگے ہوں گے۔ خدا تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ ایمان کے ساتھ عادت ضروری ہے۔ آنحضرت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم صحابہؓ کے فوجی کرتب مسجد کے صحن میں دیکھا کرتے تھے۔ صحابہؓ مسجد کے صحن میں تلواروں اور نیزوں سے لڑ کر آپ کو دکھاتے تھے۔[2] پس جب تک آپ لوگ بھی مشق نہ کریں وقت آنے پر کوئی قربانی نہیں کر سکتے اور کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ پس مَیں ایسی تمام ماؤں، باپوں اور علاقہ کے بارسوخ لوگوں کے اس طریق پر کامل افسوس کا اظہار کرتا ہوں اور ان پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر ان کا یہ خیال ہے کہ دین کے لئے قربانی کا وقت آنے پر وہ قربانیاں کر سکیں گے تو وہ غلطی پر ہیں۔ جو مائیں آج روتی ہیں وہ کل زیادہ روئیں گی اور جو باپ آج ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں وہ کل زیادہ کریں گے اور جس شکست سے یہ لوگ آج ڈرتے ہیں وہ کل زیادہ بھیانک صورت میں ان کے سامنے آئے گی کیونکہ انہوں نے خدا کی تقدیر کو تدبیروں سے ٹالنے کی کوشش کی اور اس کے فیصلے پر راضی نہ ہوئے۔"

(الفضل 17 جولائی 1942ء)

1: سیرت ابن ہشام جلد 2 صفحہ 189 مطبوعہ مصر 1295ھ

2: بخاری کِتَاب الصَّلٰوۃ باب اَصْحَاب الحِرَابِ فِی الْمَسْجِدِ